علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۷)

سعید احمد اکبر آبادی

جنوری ۱۹۶۸ء کے شروع میں اپنا ٹرم پورا کرنے سے پہلے ہی نواب صاحب علی گڑھ سے رخصت ہو گئے تو ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے سینیر پروفیسر تھے۔ اور وہ بھی عربی کے، علی گڑھ سے ان کا تعلق بہت دیرینہ تھا۔ اس بنا پر علی گڑھ کی روایات وخصوصیات اور اس کے تہذیبی کیرکٹر سے جو واقفیت ڈاکٹر صاحب کو ہو سکتی تھی باہر کے کسی شخص کو نہیں ہو سکتی تھی۔ غالباً یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر موصوف کا انتخاب اس عہدۂ جلیلہ کے لئے ہوا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم

لیکن افسوس ہے کہ یہ تجربہ ناکام رہا۔ یونیورسٹی کو اس سے فائدہ کے بجائے نقصان پہونچا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے جب اپنے عہدہ کا چارج لیا تو چونکہ گھر کے آدمی تھے اس بنا پر یونیورسٹی میں ہر جگہ اس پر عظیم مسرت کا اظہار کیا گیا۔ ہر فیکلٹی

اور اکثر ڈیپارٹمنٹس اور ہر ادارے نے الگ الگ ان کو شاندار استقبالئے دیئے۔ یہ سلسلہ دو ڈھائی مہینہ تک چلتا رہا۔ تقرر کے چند روز بعد ہی عید تھی۔ اس موقعے پر بھی اساتذہ و ملازمین کی جتنی بڑی تعداد عید کی مبارکباد دینے کی غرض سے علیم صاحب کے پاس آئی۔ شاید ہی کسی اور کے پاس آئی ہو۔ اور علیم صاحب نے بھی ان میں سے ایک ایک شخص کی خاطر تواضع کرنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ اس بنا پر اسٹاف اور عملۂ انتظامیہ نے ہمیشہ ان کے ساتھ توقیر و احترام کا معاملہ کیا۔ اور ان کے بڑے پن کا لحاظ رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ طلبار میں ان کو وہ ہر دلعزیزی اور وقار حاصل نہیں ہو سکا جو عہدہ کے اعتبار سے ان کو حاصل ہونا چاہیئے تھا کیوں؟ اس میں کچھ دخل تو ان کے ذاتی امور اور معاملات کا ہے جن کو میں زیرِ بحث لانا پسند نہیں کرتا۔ اور کچھ اس بات کا ہے کہ وہ اچھے ایڈمنسٹریٹر نہیں تھے۔ ایک کامیاب ایڈمنسٹریشن کے لئے اعلیٰ قابلیت اور بے لوث و بے غرض زندگی کے علاوہ مستحکم قوتِ فیصلہ اور مضبوط قوتِ ارادی شرطِ اولین کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ایڈمنسٹریٹر کا یہ فرض ہے کہ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ آئے تو ٹھنڈے اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ کسی ذہنی تحفظ (Mental Reservation) کے بغیر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرے۔ اور پھر کسی نتیجہ پر پہونچکر اس کا فیصلہ کرے۔ لیکن جب وہ ایک فیصلہ کرے تو اب سختی سے اس پر قائم رہے۔ یہ نہ ہو کہ کسی دباؤ یا خوف یا لالچ میں آکر اسے تبدیل کر دے۔

جہاں تک علیم صاحب کا تعلق ہے اس معاملہ میں وہ "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی" کا مصداق ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ نہایت ذہین طباع اور معاملہ فہم آدمی ہیں، موضوعِ زیرِ بحث کو فوراً سمجھ لیتے اور اس کی تہہ تک پہونچ جاتے ہیں۔ بولتے کم ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں تو دو ٹوک پائنٹ بولتے ہیں۔ ان کی تقریر مختصر ہوتی ہے اور حشو و زوائد سے پاک ساتھ ہی وہ شریف خصلت، بامروت اور رحمدل انسان

ہیں ۔ ایذا رسانی سے دور اور مرنجاں و مرنج طبیعت کے مالک ہیں ۔ لیکن یہ شریفانہ خصلت پرائیویٹ زندگی میں خواہ کیسی ہی قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہو ایڈمنسٹریشن میں اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور نظم و نسق میں خلل پڑتا ہے ۔ کیونکہ ایڈمنسٹریشن کا دار و مدار عدل انصاف پر ہے نہ کہ رحم اور کسی کی اندھا دھند مدد کرنے پر ۔ اور ایک مجرم کے ساتھ رحم کرنا ایک ادارے ایک سوسائٹی اور ایک معاشرہ پر ظلم کرنا ہے ۔ اپنی اس افتادِ طبع کے باعث علیم صاحب ایک فیصلہ پر مضبوطی سے قائم نہیں رہ سکتے تھے ۔ اور اسی افتادِ طبع کا یہ اثر تھا کہ ان کے فیصلہ ہمیشہ بے لاگ نہیں ہوتے تھے چنانچہ ان کے عہد میں کتنے فیصلے ہیں جن کا حال یہ تھا کہ آج اور، اور کل کچھ اور ۔ امتحانات کی تاریخیں مقرر ہو گئی ہیں ان کا اعلان ہو چکا ہے ۔ اور سب تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں ۔ لیکن طلبار کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کر کے تاریخوں کی تبدیلی کا مطالبہ کیا اور فوراً امتحانات کے ملتوی ہونے کا اعلان ہو گیا ۔ آج ڈسپلن کمیٹی نے کسی طالب علم کے اخراج یا اُسے کوئی اور سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ہی اس پر نظرثانی ہوئی اور فیصلہ تبدیل ہو گیا علیم صاحب کا عہد اس طرح کی مثالوں سے پُر ہے ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایڈمنسٹریشن کا وقار باقی نہیں رہا ۔ اور طلبار کے دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ جا و بے جا، درست و نادرست جو مطالبہ بھی ہم چاہیں گے ۔ وائس چانسلر سے منوالیں گے ۔

چنانچہ آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوتا رہتا تھا ۔ اور اس سلسلہ میں بعض اوقات علیم صاحب کے ساتھ اس قسم کا ناروا سلوک ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کو ان پر رحم آتا تھا اور ذاتی طور پر مجھے اب تک اس کا ملال ہے ۔ اس بنا پر ان میں اور طلبار میں ہمیشہ کشیدگی رہی طلبار یونین کے جلسوں میں کھلم کھلا جس طرح ان پر تنقید کرتے تھے ہم نے طلبار کو کسی وائس چانسلر پر اس طرح کی تنقید کرتے نہیں سُنا ۔ اس تنقید کے بعض اجزار درست ہوتے تھے اور بعض نادرست بھی ۔ لیکن لب و لہجہ غضب آلود اور توہین آمیز ہوتا تھا

اسباب خواہ کچھ بھی ہوں ، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ طلبار کا اعتماد حاصل نہیں کرسکے ۔

یہ سب کچھ تو تھا ہی کہ اتنے میں ۱۹۷۲ء کا رسوائے عالم ایکٹ آگیا ۔ اس نے جلتے پر تیل کا کام کیا یہ ایکٹ اس وقت بچے بچے کی زبان پر ہے اور اس پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں وہ بھی سب کو معلوم ہیں ۔ (میرے نزدیک اس ایکٹ پر سب سے زیادہ جامع اور ٹھوس تنقید پروفیسر تیواری کی ہے)۔ اس بنا پر اس ایکٹ کو بیان کرنے یا اس پر تنقید کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ آخر میں کروں گا ۔ یہاں کہنا یہ ہے کہ علیم صاحب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ ۱۹۶۵ء میں ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کو معطل کر دینے سے جس فتنہ کا آغاز ہوا تھا علیم صاحب کے عہد میں ۱۹۷۲ء کے ایکٹ کی شکل میں اس کی تکمیل ہو گئی ۔ اس ایکٹ کی حشر سامانی کا یہ عالم ہوا کہ یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ۔ ٹھیک اس وقت جب کہ امتحانات قریب تھے یونیورسٹی اچانک بند کر دی گئی ۔ طلبار کو بارہ گھنٹے کے اندر اندر ہوسٹل سے نکل جانے کا فرمان صادر ہو گیا ۔ طلبار کی یونین معطل کی گئی ۔ اس کے عہدہ دار گرفتار ہوئے اس دارو گیر سے بعض پرانے اور نیک نام پروفیسر بھی نہ بچ سکے ۔ وہ بھی معطل کئے گئے اس اتھل پتھل کا نہایت افسوسناک اور لائق ہزار افسوس انجام یہ ہوا کہ تعلیم اور امتحان دونوں تل پٹ ہو گئے ۔ جس سے قوم کے نوجوانوں کی مستقبل کی زندگی متاثر ہونا لازمی امر ہے ۔ کیونکہ جب امتحانات اپنے متعینہ زمانہ سے سات آٹھ مہینے لیٹ ہو گئے تو اندازہ کیجئے کہ آخری (فائنل) امتحان دینے والوں میں کتنے نوجوان ہوں گے جنہوں نے بیرونی ممالک میں یا ہندوستان میں ہی پروفیشنل تعلیم یا کسی اور ٹریننگ کے لئے یہاں یا کہیں اور داخلہ کا پروگرام بنا رکھا ہوگا ۔ یا وہ کسی مقابلہ کے امتحان میں شرکت کے امیدوار ہوں گے ۔ یا ان کو ملازمت کی توقع ہوگی ۔ اس صورتِ حال نے ان سب طلبار کی امیدوں، آرزوؤں اور امنگوں پر پانی پھیر دیا اور ان

غریبوں کا اور ان کے والدین کا دم گھٹ کے رہ گیا۔

پھر جب امتحانات شروع ہوئے تو کس طرح؟ چونکہ نتائج جلد شائع کرنے تھے اس لئے وائس چانسلر صاحب کا حکم ہوا کہ بیرونی ممتحنین جنھوں نے امتحانات کے پرچے بنائے بھی تھے ان کے پاس کاپیاں نہ بھیجی جائیں۔ اور یونیورسٹی کے اساتذہ ہی گروپ کی شکل میں جلد از جلد کاپیوں کو جانچ کر ان امیدواروں کی قسمت کا فیصلہ کردیں۔ باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ سمسٹر سسٹم کے ماتحت اول تو خارجی امتحان (External Assessment) اور داخلی امتحان (Internal Ass.) میں بہت زیادہ فرق کے باعث یونیورسٹی کا داخلی امتحان پہلے سے ہی بدنام تھا چنانچہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ بعض مواقع پر ہمارے گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ نوجوان کسی انٹرویو میں گئے ہیں اور وہاں جب انہوں نے اپنی مارک شیٹ (Mark Sheet) دکھائی تو محض اس بنیاد پر ان کا انتخاب نہیں ہوسکا کہ ان کے داخلی امتحان اور خارجی امتحان کے نمبروں میں بہت فرق تھا اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب خارجی امتحان کو بالکل ہی حذف کردیا جائے اور داخلی امتحان بھی اس طرح ہو کہ کاپیوں کو جلد از جلد گروپ کی شکل میں جانچ کر (متعلقہ شعبہ کے صدر کی نگرانی میں سہی) نتائج مرتب کرنے کی تاکید ہو تو اُس امتحان پر کہاں تک اعتبار و اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

امتحان کی اس طرح جو ابتری ہوئی وہی تعلیم کی بھی ہوئی۔ یعنی ایک سمسٹر میں دو سمسٹر کی تعلیم کا آرڈر ہوا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مثلاً ایک شخص روزانہ سات گھنٹے دفتر میں کام کرتا ہے لیکن چونکہ یہ دفتر سے ایک مدت تک غیر حاضر رہا ہے اس لئے اب جب یہ واپس آیا ہے تو تلافی مافات کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ وہ روزانہ چودہ گھنٹے کام کرے گا تو فرمایئے کیا اس کو وہ شخص دفتر کا کام کسی کے ساتھ انصاف کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں پھر اس طرح تعلیم میں جو نقص پیدا ہوگا اس پر پردہ ڈالنے کی غرض سے خارجی امتحان

کا دستور امسال بھی اُڑا دیا گیا۔ اور داخلی امتحان کو اور بھی نرم کر دیا گیا ہے تعلیم اور امتحان دونوں میں یہ بدنظمی اس لئے پیدا ہوئی کہ یونیورسٹی پانچ ساڑھے پانچ مہینہ کے لئے بغیر کسی سبب کے اچانک بند کر دی گئی اور طلباء سے ہوسٹل خالی کرائے گئے اور یونیورسٹی پر پولس کا پہرہ بیٹھ گیا

یہ جو کچھ اندھیر مچا اور آفت آئی علیم صاحب کے عہد میں .... اور اُنکے حکم سے آئی۔ مجھکو اس کا یقین ہے کہ علیم صاحب جس مرنجِ مرنجان اور رحم دل طبیعت کے آدمی ہیں اس کی وجہ سے یہ سب چیزیں انکی اپنی پسند کی نہیں تھیں اور وہ ان پر خوش اور مطمئن ہرگز نہیں تھے لیکن اب انکی ایک اور کمزوری سامنے آئی اور وہ یہ کہ وہ عملاً حکومت کے آلۂ کار ہو کر رہ گئے علیم صاحب نے اپنے آپ کو مکمل طور پر وزارتِ تعلیم کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے جو احکام آتے تھے علیم صاحب کے دستخط سے یونیورسٹی میں جاری ہوتے تھے لیکن قانون میں ذمہ داری سبب فعل پر نہیں بلکہ مباشر بالفعل پر آتی ہے۔ اس لئے تاریخ کا فرشتہ یہ سب کچھ لکھے گا علیم صاحب کے نامۂ اعمال میں ہی [1]

---

[1] لیکن سیاست کی شاطرانہ چالوں کی بوقلمونی ملاحظہ فرمائیے یوپی کے الیکشن میں مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے عین اس موقع پر اخبارات میں اطلاع آئی کہ علیم صاحب نے استعفا دے دیا ہے اور گورنمنٹ نے اسے منظور کر لیا ہے۔ حالانکہ جب وائس چانسلری کی مدت کے ختم ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے، تو اب استعفار کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن درحقیقت گورنمنٹ مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا علیم صاحب کی دھاندلی سے ہوا۔ گورنمنٹ کا اس میں دخل نہیں ہے اور مسلمان ان سے ناراض نہیں تو اب استعفا لیکر ان کو الگ کر دیا گیا ہے۔ اور اس طرح گویا مسلمانوں کے مطالبات کی ایک قسط منظور کر لی گئی ہے۔ چنانچہ اس خیال کو مستحکم کرنے کی غرض سے ادھر علیم صاحب علیگڑھ سے رخصت ہوئے، اور ادھر نظر بند طلباء رہا ہوئے۔ اور معطل اساتذہ بحال کر دیئے گئے۔ لیکن ایک شخص دریافت کر سکتا ہے کہ اگر علیم صاحب گورنمنٹ کے نزدیک مجرم اور مسلمانوں کی بے چینی اور یونیورسٹی کی تخریب کے ذمہ دار تھے تو ان کو اس انعام کے دیئے کا کیا مطلب ہے۔ کہ وہ یونیورسٹی سے الگ ہوئے اور انہیں ایک عظیم سرکاری ادارے کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔

تمام ماہرینِ تعلیم کی متفقہ رائے کے مطابق ایک یونیورسٹی کے لئے سب سے مقدم اور ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار (Autonomous) ہو لیکن بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک اس یونیورسٹی کے معاملہ میں اس اصول کو جس طرح پامال کیا گیا ہے پورے ملک میں کسی یونیورسٹی کے معاملہ میں اس طرح پامال نہیں کیا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا ادارہ ہے اور مسلمان بحیثیت ایک فرقہ (Community) کے اب تک حکومت کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں؟

علیم صاحب نے اپنے دور کے آخری دنوں میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کو پرو وائس چانسلر مقرر کر دیا تھا۔ نظامی صاحب بین الاقوامی شہرت کے اسکالر، اردو اور انگریزی کے بلند پایہ مصنف اور محقق ہیں۔ ان کا اصل مضمون ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ ہے۔ لیکن اسلامی تصوف پر ان کی تصنیفات کیف و کم کے اعتبار سے اس مرتبہ کی ہیں کہ آج ان کو تصوفِ اسلام کی تاریخ پر ایک سند (Authority) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے اسکالر عام طور پر انتظامی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ لیکن نظامی صاحب اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ انہوں نے پہلے ایس۔ ایس ہال کے پرووسٹ (Provost) اور طلبا کے معاملات کے ڈین مقرر ہو کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ انتظامی امور و معاملات میں بھی نہایت چست، مستعد، محنتی اور ہوش و گوش کے انسان ہیں۔ فیصلہ بہت جلد کرتے ہیں۔ اور آج کے کام کو کل پر اٹھا کر نہیں رکھتے ہیں۔ اس بنا پر اس میں شبہ نہیں کہ علیم صاحب عمر رسیدہ اور اپنے کچھ عوارض کے باعث زیادہ محنت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو نظامی صاحب سے زیادہ بہتر اور معتمد اور معین و مددگار نہیں مل سکتا تھا[1]

---

[1] یہ الگ بات ہے کہ نظامی صاحب سے دیرینہ اور عزیزانہ تعلق کی بنا پر میری ہمیشہ یہ رائے رہی اور اب بھی ہے کہ ان کو ایڈمنسٹریشن کی دردِ سر اور گراں بار ذمہ داریوں سے الگ رہنا چاہیے تاکہ
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بدقسمتی سے ۱۹۵۱ء ایکٹ کے سلسلے میں یونیورسٹی میں جتنے ہنگامے ہوئے، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ سب نظامی صاحب کی پرو وائس چانسلر شپ کے زمانے میں ہوئے اور یونیورسٹی کے کم و بیش سبھی کاموں کا بوجھ انھوں نے اپنے سر لے رکھا تھا۔ اس لئے ان حالات سے یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر مسلمانوں میں جو دل گرفتگی اور بیزاری پیدا ہوئی اسکا ذمہ دار عام طور پر نظامی صاحب کو قرار دیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے اندر بھی ایک بڑا طبقہ اس خیال کا پیدا ہوگیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے نظامی صاحب کی دھاندلی اور ضد سے ہو رہا ہے۔ ورنہ علیم صاحب اس سے متفق نہیں ہیں اور ان کی ہمدردیاں مظلوم طلبار اور اساتذہ کے ساتھ ہیں۔ میں نے خود بڑی حیرت سے سنا اور دیکھا کہ کل جو لوگ علیم صاحب کے سب سے بڑے نقاد تھے آج وہ ان کے انتہائی مداح تھے۔ یہ تعجب اور بھی زیادہ ہوا جب میں نے یونیورسٹی میں تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز رکن کو علیم صاحب کی شان میں ایک پرزور مدحیہ قصیدہ پڑھتے اور اس کے بالمقابل نظامی صاحب کی مذمت کرتے سنا۔

لیکن درحقیقت اس طرح کی خیال آرائیاں واقعات کے سرسری مطالعہ اور یونیورسٹی کے آئین و ضابطہ سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ یونیورسٹی کے آئین کی رو سے پالیسی تمام تر وائس چانسلر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں اس کا فیصلہ ہی حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔ پرو وائس چانسلر صرف اس پالیسی کو عمل میں لانے اور اس کے مطابق کام کرنے کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :-

آجکل کے عام معاملات کے پیشِ نظر یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ ہرگز ایسی اہم اور وقیع چیز نہیں ہے کہ نظامی جیسا شخص اپنا مطالعہ، تحقیق، تصنیف و تالیف، صحت و تندرستی، دل کا چین اور دماغ کا سکون یہ سب کچھ قربان کرکے اس متاعِ کم مایہ کی قیمت ادا کرے۔ وائس چانسلر شپ کے لئے دوسرے لوگ بھی ہو سکتے ہیں لیکن علم و تحقیق کی دنیا میں جو کام نظامی کر سکتے ہیں وہ دوسرا نہیں کر سکتا۔

ذمہ دار ہوتا ہے ۔ وائس چانسلر اپنی صوابدید کے مطابق جس شخص کو چاہے اپنی مدد کے لئے پرو وائس چانسلر مقرر کر سکتا ہے ۔ اور اگر پالیسی میں اختلاف پیدا ہو جائے تو جب چاہے اسے الگ کر سکتا ہے ۔ اس بنا پر یہ سمجھنا قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ یہ جو کچھ ہوا علیم صاحب کی پالیسی کے خلاف اور ان کی مرضی کے بغیر نظامی صاحب کی ناروا در اندازی اور آزادرائے سے ہوا ۔ ورنہ اگر حقیقت یہی ہوتی تو علیم صاحب کے علی گڑھ سے رخصت ہونے پر نظر بند طلبار رہا اور معطل اساتذہ بحال نہ ہوتے ۔ کیونکہ نظامی صاحب اس وقت تو صرف پرو وائس چانسلر ہی تھے ۔ اور اب تو وہ قائم مقام وائس چانسلر ہیں ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی امر میں وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کی رائے میں اختلاف ہو ۔ اور پھر وائس چانسلر دلائل کی قوت سے وائس چانسلر کو اپنا ہم خیال بنالے ۔ بہرحال پالیسی ، آخری فیصلہ اور حکم کا اجرا یہ سب وائس چانسلر کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اور اس بنا پر اچھے برے کی ذمہ داری اسی کے سر عائد ہوتی ہے ۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا طلبار اور ان کے مسائل و معاملات سے متعلق تھا ۔ اب انتظامیہ کو دیکھئے تو علیم صاحب کی ضرورت سے زیادہ شرافتِ نفس ، انسانی ہمدردی اور رحمدلی نے اس میں بھی اپنا رنگ دکھایا ۔ مجھے ایک دو نہیں اس قسم کے متعدد واقعات معلوم ہیں کہ ایک شخص نے شدید جرم یا جرائم کا ارتکاب کیا ہے تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کی گئی ۔ اور اگر سزا کے طور پر اس کو اس جگہ سے ہٹا دیا گیا تو اسے پھر کسی دوسری جگہ پر لگا دیا گیا ۔ اس پر رجسٹرار یا ڈپٹی رجسٹرار کسی نے کہا ۔ حضرت ! یہ تو مجرم تھا ۔ تو علیم صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا : ہاں بیشک ۔ یہ تو مجرم تھا ۔ لیکن یہ بتائیے کہ اس کی بیوی اور بچوں نے کیا جرم کیا ہے جو وہ بھوکے مر رہے ہیں ۔ کل یہ سب روتے ہوئے میرے پاس آئے تھے اب بتائیے میں کیا کروں ؟ علیم صاحب اس انسانی ہمدردی میں لتنے

فیاض یا خود سر واقع ہوئے ہے کہ پراکٹر کی رپورٹ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق جس کی عدم موجودگی یا جس کے امیدوار کے خلاف ہونے کی صورت میں کسی شخص کا تقرر نہیں ہوتا علیم صاحب اسکی کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتروں میں ناپسندیدہ افراد گھس گئے پچھلے دنوں مختلف شعبوں سے ٹائپ رائٹر کے چوری ہونے کی وارداتیں کثرت سے ہوئیں۔ مولانا آزاد لائبریری میں ڈاکہ پڑا۔ یونیورسٹی اکاؤنٹ میں سے کسی شخص نے دھوکہ دیکر ایک بہت بڑی رقم اڑالی۔ میرے نزدیک یہ سب کچھ علیم صاحب کی اسی ہمدردی اور رحدلی کا شاخسانہ ہے۔ علیم صاحب کا معاملہ جب غیروں کے ساتھ یہ تھا تو اپنوں کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوتا۔ چنانچہ جب انکے صاحبزادے کا تقرر سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر کی پوسٹ پر ہوا تو اُس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ یونیورسٹی کے حلقہ میں چہ می گوئیاں ہوئیں پمفلٹ شائع ہوئے۔ بعض لوگ اسے پارلیمنٹ میں اٹھانے کی سوچ رہے تھے پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ آں حضرت صلعم نے ایسے ہی موقعوں کے لئے فرمایا ہے اِتقوا مَوَاضِعَ التُّھَمُ یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو۔ علیم صاحب نے اسکی پرواہ نہ کی۔

غرض کہ اس میں شک نہیں علیم صاحب بڑے شریف النفس۔ بامروت۔ باوضع۔ ہمدرد و غمگسار۔ سنجیدہ و متین اور دوست نواز انسان ہیں اور انکی دوست نوازی سے میں علی گڑھ میں ہی نہیں بلکہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ سے فائدہ اٹھاتا رہا ہوں جس کے لئے میں انکا شکر گذار ہوں۔ لیکن وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔

علی گڑھ یونیورسٹی قبل از تقسیم و بعد از تقسیم کا جائزہ ختم ہوا۔ اب آخر میں گورنمنٹ اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء اور عام مسلمانوں سے اس سلسلے میں کچھ معروضات کرنی ہیں

گورنمنٹ کی توجہ کے قابل

یونیورسٹی کی تاریخ جو بیان کی گئی اس سے یہ صاف ظاہر ہے جس کی تردید نہیں ہو سکتی کہ

(۱)۔ سرسید کی زیر قیادت اینگلو محمڈن کالج مسلمانوں نے اپنے سرمایہ سے قائم کیا تھا۔

(۲) اس کالج کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کے لئے جو تعلیم میں بہت پسماندہ تھے، جدید تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا تھا۔ اگرچہ اس کا دروازہ غیر مسلموں کے لئے بھی کھلا ہوا تھا۔

(۳)۔ یہی کالج آگے چل کر یونیورسٹی بنا۔ اس کی جدوجہد اور سرمایہ کی فراہمی بھی مسلمانوں نے ہی کی۔

(۴)۔ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی صرف ایک تعلیمی درسگاہ نہیں تھی۔ بلکہ کالج کے اساسی مقصد کے ماتحت مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایات و ثقافت کا بھی ایک عظیم الشان ادارہ تھی۔

(۵) اس بنا پر نہ صرف برصغیر ہندو پاک کے مسلمان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس یونیورسٹی کے ساتھ غیر معمولی محبت اور قلبی لگاؤ ہے۔ ان کی یہ تمنا اور آرزو ہے کہ وہ ہمیشہ اسلامی ثقافت و تہذیب کے ایک عظیم نمائندے ادارہ کی حیثیت میں قائم رہے۔

(۶)۔ ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی اور ملک میں جمہوریت کے قیام کے بعد یہ ضروری تھا کہ یونیورسٹی کا اصل کیرکٹر قائم رکھتے ہوئے یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی جائیں جن کے باعث یونیورسٹی کے اصل کردار اور جمہوریت کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کی جاسکے اس میں شک نہیں کہ یہ وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگر سرسید حیات ہوتے تو وہ خود اس معاملہ میں پیشقدمی کرتے۔

(۷)۔ ۱۹۵۱ء ایکٹ اسی سمت میں ایک اقدام تھا جس پر حکومت مطمئن اور مسلمان رضامند تھے۔ اور جس کو مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی اور دیگر مسلمان ممبران پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر تمام مسلمان اداروں اور جمعیتوں کی منظوری و پذیرائی حاصل تھی۔

(۸) ۱۹۶۵ء میں ایک ہنگامہ پیدا ہوا اور اس ایکٹ کو معطل کر کے گورنمنٹ نے

اپنی نامزد کردہ ایگزیکٹو کونسل یونیورسٹی پر مسلط کر دی۔ اور یہ اعلان ہوا کہ اب یونیورسٹی کے لئے الگ ایک ایکٹ بنے گا۔

(۹)۔ اس سے مسلمانوں میں تشویش پیدا ہوئی اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ ایکٹ جلد بنے۔ گورنمنٹ نے غیر رسمی طور پر کیبنٹ کے ایک ممتاز وزیر کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کر دی جس نے ممتاز مسلمان رہنماؤں اور تعلیم کے ماہروں کے باہم مشورہ اور اتفاق سے ایکٹ کا مسودہ تیار کر لیا۔

(۱۰) مسلمانوں کو یقین تھا کہ اس مسودہ کے مطابق پارلیمنٹ میں بل پیش ہوگا۔ اور منظور ہو جائے گا۔ لیکن ان کی حیرت اور مایوسی کی کوئی حد نہیں رہی۔ جب پارلیمنٹ میں جھٹ پٹ ۱۹۵۱ء ایکٹ پیش ہوا اور منظور بھی ہو گیا اور یہ اس مسودہ سے مختلف تھا جس پر پہلے سب کا اتفاق ہو چکا تھا۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ یہ ایکٹ جمہوریت کے تقاضوں اور مطالبات کے بھی خلاف تھا۔ اور اس میں یونیورسٹی کے اسلامی اور آج کل کی بول چال میں اقلیتی کردار کے تحفظ کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی۔

(۱۱)۔ اس پر ملک میں ایجی ٹیشن ہوا۔ مسلمانوں کے مختلف سیاسی اور غیر سیاسی پلیٹ فارموں سے اس کے خلاف سخت احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اور یہ مسئلہ حکومت کے خلاف مسلمانوں کی شکایتوں میں سرفہرست آگیا۔

(۱۲)۔ حکومت نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی غرض سے اس ایکٹ میں کچھ ترمیم و تنسیخ کر دی۔ لیکن ایجی ٹیشن اب بھی بند نہیں ہوا مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے تحفظ کی گارنٹی ہونی چاہیئے۔

ان تنقیحات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے حکومت کا ذہن اب تک صاف نہیں ہے۔ اس لئے کبھی کچھ کرتی ہے اور کبھی کچھ۔ اعلان کچھ ہوتا ہے۔ اور عمل کچھ۔ اور ایک بل بنتا ہے اور پھر اس میں ترمیمات

شروع ہوجاتی ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کے متعلق اُس کا یہ رویہ اس لئے ہے کہ اس کے تحت الشعور میں اب تک مسلمانوں کے لئے وہ وسعتِ قلب نہیں پیدا ہو سکی ہے جو اس ملک کی اکثریت یا اور اقلیتوں کے لئے ہے۔

اس ملک میں اکثریت کے تہذیبی اور ثقافتی ادارے بھی ہیں۔ اور اقلیتوں کے بھی۔ وِسوا بھارتی اور بنارس ہندو یونیورسٹی، علی گڑھ کی طرح یہ دونوں بھی مرکزی گورنمنٹ کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کے تہذیبی اور ثقافتی ادارے ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا کہ علوم جدیدہ کے ساتھ یہاں ہندوؤں کے پرانے علوم و فنون، مذہب، فلسفہ اور زبان و روایاتِ قدیمہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ اور صرف تعلیم ہی نہیں ان روایات کے مطابق تربیت بھی ہوتی ہے۔ اور وہاں ہوسٹل میں رہنے والے طلبار کے لئے جو قواعد و ضوابط ہیں ان میں ان سب چیزوں کی رعایت رکھی گئی ہے۔ فرق صرف اسی قدر ہے کہ وسوا بھارتی ڈاکٹر ٹیگور کے فلسفہ و خیال کی ترجمان ہے جو کہ موحد تھے اور ہندو یونیورسٹی ہندوؤں کے دیرینہ مذہب و ثقافت کی نمائندہ ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اول الذکر یونیورسٹی کا نظام اور ایڈمنسٹریشن تمام تر ڈاکٹر ٹیگور کے ہم خیال بنگالیوں اور مؤخر الذکر یونیورسٹی کا ایڈمنسٹریشن ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، ہونا یہی چاہئے تھا جب یہ تہذیبی اور کلچرل ادارے ہیں تو ضروری ہے کہ جو لوگ اس تہذیب اور کلچر کے نمائندے اور علمبردار ہیں۔ ان اداروں کا ایڈمنسٹریشن بھی انہیں کے ہاتھ میں ہو۔ یعنی ادارہ کے ہر شعبہ میں اکثریت انہیں کی ہو۔ انگریزوں کے زمانہ میں ہندو بنارس یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دونوں فرقہ وارانہ (Communal) یونیورسٹیاں تھیں۔ چنانچہ اول الذکر کے کورٹ اور ایگزیکٹو کونسل کا ممبر غیر ہندو اور مؤخر الذکر کی ان مجلسوں کا ممبر کوئی غیر مسلم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن آج ملک آزاد ہے۔ ہماری قومی حکومت قائم ہے۔ اور اس کا دستور جمہوری ہے اس بنا پر اب یہ ادارے قدیم حیثیت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے

تھے ۔ اس بنا پر ہندو بنارس یونیورسٹی کے قدیم ایکٹ میں بھی ترمیم ہوئی ۔ اور یہاں ۱۹۵۱ء کا ایکٹ معرض وجود میں آیا ۔ لیکن بہرحال ان یونیورسٹیوں کا تہذیبی کیرکٹر قائم رکھنا تھا اس بنا پر جمہوریت کے تقاضوں سے ساتھ کیرکٹر کے تحفظ اور بقا کے مسئلہ کو اس طرح ہم آہنگ کیا گیا کہ لیگزیکٹیو کونسل اور کورٹ کی ممبری کا دروازہ تو ہر ایک کے لئے واکردیا گیا ۔ لیکن ان میں اکثریت انہیں لوگوں کی رکھی گئی جو تہذیب متعلقہ کے نمائندے اور علمبردار تھے ۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے جو مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتوں کے ادارے ہیں ان کا حال بھی یہی ہے ۔ یعنی جو عیسائی ادارے ہیں ان کا ایڈمنسٹریشن عیسائیوں کے ہاتھ میں اور جو سکھ ادارے ہیں ان کا ایڈمنسٹریشن سکھوں کے ہاتھ میں ہے ۔ پس جب یہ چیز سب جگہ ہو رہی ہے ۔ تو مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں کیوں نہیں ہو سکتی ؟ گورنمنٹ نے ۱۹۷۲ء کے ایکٹ میں چند ترمیمات منظور کر کے اس منزل کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے ۔ لیکن جب تک خود ایکٹ میں ترمیم نہ ہو ان تحفظات کی آئینی حیثیت قائم نہیں ہوتی ۔ مسلمان اقلیتی کردار کے تحفظ کا جو مطالبہ کرتے ہیں اسکا یہی مطلب ہے اور اس کے تسلیم کر لینے میں گورنمنٹ کو پس وپیش نہیں ہونا چاہئے ۔

علاوہ ازیں معاملہ کا ایک پہلو اور بھی ہے ۔ اور وہ یہ کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کا ذکر نہیں ۔ آج ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد سو سے اوپر ہے ۔ لیکن غور کیجئے کہ ان یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبار اور مسلمان اساتذہ کا فی صد کیا تناسب ہے؟ اس کے برخلاف علی گڑھ میں غیر مسلم اساتذہ اور طلبار کا کیا تناسب ہے ؟ اگر پہلی صورت میں تناسب نہ ہونے کے برابر ہے تو گورنمنٹ کو سوچنا چاہئے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اسکی ایک وجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی بھی ہے لیکن اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے ۔ اس کے ایک دو نہیں کثرت سے ثبوت موجود ہیں ۔ ایک مشہور یونیورسٹی کے ایک ہندو پروفیسر جو صدر شعبہ بھی تھے اور میرے بہت بے تکلف دوست ، انہوں نے خود مجھ سے کہا کہ

ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شعبہ میں لکچرر کی پوسٹ کے لئے ایک مسلمان امیدوار لڑکی کا انتخاب سلیکشن کمیٹی سے لڑجھگڑ کر محض اس لڑکی کی اعلیٰ قابلیت اور لیاقت کی بنیاد پر کرالیا تو ان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اور ان پر لعن طعن کی بوچھار ہوگئی مگر یہ بھی ضد کے پورے تھے۔ اپنی بات پر اڑے رہے اور آخر یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل نے بھی سلیکشن کمیٹی کے اس فیصلہ کو منظور کر لیا۔ اور یہ لڑکی اب بھی نیک نامی اور قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔ پس ان حالات میں اگر مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھنا اور اپنی پسماندگی دور کرنا ہے تو کیا خود ملک اور قوم کے مفاد کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کو اس کی اپنی تاریخی حیثیت کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ اور اس کو دستوری اعتبار سے دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایسا نہ بنا دیا جائے کہ مسلمان طلبار اور مسلمان اساتذہ کو یہاں بھی جگہ پانے میں دقت اور دشواری محسوس ہو۔ سرسید کی تقریریں اور تحریریں پڑھئے آپ کو محسوس ہوگا کہ ان کے زمانہ میں بھی مسلمان طلبار کے لئے یہی دشواریاں تھیں جن کی وجہ سے انہوں نے کالج قائم کیا تھا۔ یہ وہ حقائق اور واقعات ہیں جن پر حکومت کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہئے۔

طلبار اور اساتذہ سے گزارش

یونیورسٹی کے لئے اقلیتی کردار کا مطالبہ کرنے میں یونیورسٹی کے طلبار اور اساتذہ نے بھی مجموعی طور پر گرم جوشی سے حصہ لیا ہے۔ لیکن ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کا یہ مطالبہ اسی وقت باوزن اور وقیع ہو سکتا ہے جب کہ وہ علماً اور عملاً یونیورسٹی کی تہذیبی روایات کے حامل ہوں اور اس کی صورت یہی ہے کہ سیاست کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر ایک طرف وہ کردار۔ اخلاق و عادات اور طور طریق زندگی کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہوں۔ اور دوسری طرف تعلیم، تحریر و تقریر اور اسپورٹس وغیرہ میں ایسے کامل ہوں کہ ان کے ذریعہ ان کے خاندانوں کو فائدہ پہونچے۔ یونیورسٹی کا نام روشن ہو اور ملک و قوم ان کی خدمات سے مستفید ہو۔

اس وقت جبکہ ملک ایک نہایت بھیانک اور شدید بحران کے دور سے گذر رہا ہے اور نوجوان طلبار میں سخت اختلال و انتشار ذہنی و قلبی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبار علوم و فنون اور اعلیٰ اخلاق سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ملک کو اس بحران سے نکالنے میں اپنا رول ادا کریں۔ یہ کام نعرہ بازی سے نہیں ہو سکتا اقبال کے ان اشعار کو اپنا رہنما بنانے سے ہو سکتا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

اس سلسلہ میں اساتذہ کے فرائض اور بھی اہم ہیں۔ یہ قوم کی تعمیر اور اس کو قعر انحطاط سے نکال کر مصطبۂ عزت و وجاہت پر بیٹھلانے کا وقت ہے۔ اس لیے وقت کا اور خصوصًا اسلام کا ان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی راحت و آسائش اور شخصی رفاہیت و ترقی اور غیر علمی و تعلیمی دلچسپیوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے اوقات طلبہ کی تعلیم و تربیت اور اپنے ذاتی مطالعہ اور ریسرچ کے لئے وقف کر دیں۔ یہی ان کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ میرا تعلق ہندوستان کی اور بیرونی ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں سے رہا ہے اور میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اپنے اپنے وسائل کے اندر جس ٹھاٹ باٹ اور خوش عیشی کی زندگی علی گڑھ کے اساتذہ گذارتے ہیں۔ کسی اور یونیورسٹی کے اساتذہ اس طرح نہیں گذارتے اور جتنا کم تعلق یہاں کے اساتذہ کو طلبار سے ہوتا ہے۔ اتنا کسی یونیورسٹی کے اساتذہ کا نہیں ہوتا۔ مولانا آزاد لائبریری

کے لائبریرین سے دریافت کیجئے کہ سال بھر میں کتنے اساتذہ نے اپنے نام کتنی کتابیں اشو کرائی ہیں ۔ تو آپ کو اس کا جواب حوصلہ افزا نہیں ملے گا ۔ اگر آپ اسی کی تحقیق کریں کہ سال بھر میں اساتذہ کے ریسرچ اور علمی مقالات وکتب کا اوسط کیا ہے تو آپ کو امید آفرین اعداد و شمار نہیں ملیں گے ۔ کلکتہ یونیورسٹی جیسی یونیورسٹیوں میں یہ قاعدہ ہے کہ اگر پانچ برس کے اندر اندر کسی پروفیسر نے کوئی ریسرچ ورک نہیں کیا ہے تو اس سے جواب طلب کیا جاتا ہے اور اگر جواب اطمینان بخش نہیں ہوتا تو اس کی ترقی روک لی جاتی ہے ۔ بدر الدین طیب جی نے یہ قاعدہ یہاں بھی جاری کرنا چاہا تھا ۔ لیکن یار لوگوں نے کھنڈت ڈال دی ۔ اور انکی ایک نہ چلنے دی ۔ کیونکہ بعض اچھے اچھے سینیر پروفیسر اس لپیٹ میں آجاتے ۔ کتنا افسوس اور دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ مختلف علوم وفنون ۔ مڈیسن ، انجینیرنگ ، سائنس اور ٹکنالوجی میں انعامات پانے والوں کی فہرستیں یا ان کے کارناموں کا تذکرہ آئے دن اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے ۔ اور ان میں ایک نام بھی علی گڑھ کا نہیں ہوتا ۔

مسلمانوں سے گذارش

آخر میں مسلمانوں سے یہ گذارش ہے کہ آپ کا یونیورسٹی کردار کے لئے اقلیتی کردار کا مطالبہ برحق ، اس کو منوانے کے لئے آپ کا جوش وخروش لائق تحسین و ستائش ! لیکن آپ کو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ آج یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ کم و بیش ایک کروڑ روپیہ ہے ۔ اس سے علاوہ کروڑوں روپیہ کی عمارتیں اور پروجیکٹ اب تک بن کر تیار ہو چکے ہیں ۔ یہ سب روپیہ گورنمنٹ کے خزانہ ہی سے تو آیا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ آپ کا بھی تو کچھ فرض ہے یا نہیں ؟ اقلیتی کردار کی حفاظت کا عملی طریقہ یہ ہے کہ لائق اور فرسٹ کلاس مسلمان طلبا زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخلہ لیں ۔ اسی طرح یونیورسٹی میں کوئی جگہ خالی ہو تو اس کے لئے بہتر سے بہتر مسلمان امیدوار موجود ہوں ۔ جہاں تک طلبا کا تعلق ہے وہ اسی وقت میسر آسکتے ہیں جب کہ انکی ہائی اسکول یا ہائر سیکنڈری اسکول

کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی ہو۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱)۔ ملک میں اور خصوصاً شمالی ہند میں مسلمانوں کے جو ہائی اسکول یا انٹر کالج ہیں ان کو بلڈنگ۔ لائبریری لیبوریٹری۔ کھیل کے میدانوں۔ اساتذہ کی لیاقت وقابلیت اور ہوسٹل وغیرہ کے اعتبار سے بہترین سکول اور کالج بنایا جائے۔

(۲)۔ جو طلبا ذہین اور پڑھنے کے شوقین ہیں مگر غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تعلیم اور صحت بخش غذا اور دوسری ضرورتوں کا انتظام کیا جائے۔

(۳) جو طلبا ذہین اور ہونہار ہیں مگر بدقسمتی سے ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں وہ یکسوئی کے ساتھ اپنا کام نہیں کرسکتے۔ مثلاً ایک چھوٹا سا گھر ہے اور اس میں ماں باپ کے علاوہ آٹھ نو بہن بھائی رہتے ہیں ان کو اس ماحول سے نکال کر ہوسٹلوں میں رکھا جائے۔

(۴) جو مسلمان بچے۔ مثلاً کرخنداروں اور معمولی کاریگروں اور چھوٹے درجہ کے دوکانداروں کی اولاد، جو عام طور پر تعلیم سے الگ رہتے ہیں۔ ان میں جو ذہین بچے ہیں ان کے والدین کو سمجھا بجھا کر انہیں تعلیم پر مائل کرنا اور انکے لئے اس سلسلہ میں سہولتیں اور ترغیبات بہم پہنچانا۔

اگر یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو یونیورسٹی کے عظمت کے ساتھ محفوظ رکھنا ہے تو یہ سب کام ایک ٹھوس اور پائیدار تنظیم کے ساتھ مسلمانوں کو لازمی طور پر کرنے ہیں۔ ورنہ اگر گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو تسلیم بھی کرلیا تو جب فرسٹ کلاس مسلمان طلبا کثیر تعداد میں آئیں گے ہی نہیں تو یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ایک کلاس میں جتنی سیٹیں (Seats) ہیں ان کو خالی رکھا جائے یا جس کلاس میں داخلہ کے لئے فرسٹ کلاس ہونے کی شرط ہے اس کو سیکنڈ کلاس مسلمان لڑکوں سے پر کردیا جائے۔ اسی طرح یونیورسٹی کا اسٹینڈرڈ گرےگا اور اس کی عظمت پر حرف آئےگا۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

(ختم شد)